رجسٹر نمبر اے ۹۲۲

ٹیلی فون نمبر ۷۹

تار کا پتہ
"انجمن" علی گڑھ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو ہند، علی گڑھ کا پندرہ روزہ اخبار

قیمت فی پرچہ دو آنے | سالانہ چندہ دو روپیہ

جلد ۱۲ | ۱۵ اپریل سنہ ۱۹۵۳ء | ایڈیٹر قاضی عبدالغفار | ۹ شعبان سنہ ۱۳۷۲ھ | نمبر ۳۲

رسم الخط — اردو اور دیوناگری

(از مہاتما گاندھی)

میں مانتا ہوں کہ لکھاوٹوں میں اپنی خوبیوں کے اعتبار سے سب سے آگے دیوناگری ہے۔ جب میں یہ کہتا ہوں تو کوئی نئی بات نہیں کہتا۔۔۔۔۔۔ میں اس کا ذکر صرف اس لئے کرتا ہوں کہ میرے دل میں ہندی کے متعلق ذرا سی بھی بے اطمینانی نہیں ہے۔ لیکن جب ناگری کے پریمی اردو لکھاوٹ کی مخالفت کرتے ہیں تو مجھے اس مخالفت میں نفرت اور نارواداری کی بو آتی ہے۔ مخالفت کرنے والوں میں اپنے اوپر اتنا بھی اعتماد نہیں کہ وہ یہ سمجھیں کہ اگر دونوں میں ناگری رسم الخط بہتر ہے تو آخرکار اسی کو سب اختیار کریں گے۔ اگر وہ اس نقطۂ نظر سے غور کریں تو وہ میرے فیصلے (ہندوستانی اردو اور ہندی دونوں لکھاوٹوں میں) کو صحیح اور ناگزیر پائیں گے۔

میں بلاشبہ ہندوستانی کا حامی ہوں۔ اس کا بھی مجھے یقین ہے کہ اردو اور ناگری لکھاوٹوں میں آخرکار ناگری رسم الخط زیادہ کامیاب ہوگا۔ لیکن اگر ہم رسم الخط کے سوال سے قطع نظر کرکے صرف زبان کے مسئلے پر سوچیں تب میں کہوں گا کہ آخرکار ہندوستانی زبان ہی کی جیت ہوگی۔ اس لئے کہ سنسکرت آمیز ہندی بالکل مصنوعی ہے اور ہندوستانی بالکل قدرتی زبان ہے۔ اسی طرح فارسی ملی ہوئی اردو بھی غیر قدرتی ہے۔ جو ہندوستانی میں بولتا ہوں اس میں الفاظ زیادہ نہیں ہیں۔ لیکن میرے مسلمان دوست اور پنجاب اور شمالی ہندوستان کے ہندو مجھے یقین دلاتے ہیں کہ جو ہندوستانی میں بولتا ہوں اسکے سمجھنے میں انہیں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ ہندی کے حق میں مجھے زیادہ دلیلیں نہیں ملتیں۔

میں یہ عبارت اس وقت لکھ رہا ہوں جب میں اپنے فاقے کے چھٹے دن بستر پر پڑا ہوا ہوں۔ بہت سی دردناک باتیں میرے دماغ میں چکر لگا رہی ہیں مگر ان کا ذکر نہیں کرتا۔۔۔۔۔۔ (لیکن میں پوچھتا ہوں کہ) کس ہندوستانی کا دل اقبال کی اس نظم کو سن کر نہیں دھڑکتا۔

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"

کیا کوئی دل ایسا بھی ہے جو اس نظم کو سن کر نہ دھڑکے تو اسے میں بدنصیب سمجھتا ہوں۔ اقبال کی اس نظم کی زبان ہندی ہے، ہندوستانی ہے یا اردو ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ ہندوستانی زبان قومی زبان نہیں ہے۔ اگر میں ہی یہ بات کہنے والا ہوں تو مجھے تو صاف یہ بات نظر آتی ہے کہ نہ تو سنسکرت ملی ہوئی ہندی اور نہ فارسی ملی ہوئی اردو کی جیت ہوگی بلکہ جیت صرف ہندوستانی کی ہوگی۔ جب ہم اپنے جھگڑوں سے دست بردار ہوں گے تب ہی ہم اس مصنوعی بحث کو بھول جائیں گے اور اس بحث کو پیدا کرنے پر شرمائیں گے۔

نئی دہلی۔ ۱۸ جنوری ۱۹۴۸ء

۵ بجکر ۴۵ منٹ شام

(از ہریجن۔ ۱۰ اپریل ۱۹۴۸ء)

اہل قلم کی مشکلات

نہیں کہا جاسکتا کہ کوئی آزاد ملک اپنی آزادی کی بنیادوں کو مستحکم کرسکتا ہے اگر وہ اپنے اہل قلم اور دانشوروں کے حالات کو ایسا نہ بنا سکے کہ ان کے قلم و دماغ سے ملک کے ذہنی اور تہذیبی ارتقا کو پوری مدد مل سکے۔ ہندوستان کو آزاد ہوئے ۱۰ سال ہو گئے۔ ملک کی صنعتی اور اقتصادی منصوبہ بندی پر پورا زور صرف کیا جارہا ہے۔ کلچر اور تہذیب کے نام سے بھی ملک کے ہر گوشے میں تحریکیں شروع ہو چکی ہیں۔ لیکن ملکی زبانوں کے اہل قلم کے حالات پر اگر کسی گوشے میں کوئی توجہ کی بھی جارہی ہے تو وہ بہت کم۔ ادبی اور کلچرل اداروں کے احیا کے لئے جو منصوبے بنائے جارہے ہیں وہ زیادہ تر کاغذی ہیں۔

حال ہی میں لکھنؤ کے ایک انگریزی اخبار میں "سیتیان" کے نام سے کسی صاحب نے ایک اچھا مضمون لکھا ہے اور ملک کے ادب کی پسماندگی پر افسوس کیا ہے۔ لیکن انھوں نے لکھا ہے کہ ملکی زبانوں کے ادب کی پسماندگی کا بھی الزام خود اہل قلم پر عاید ہوتا ہے جو اعلیٰ درجے کا ادب پیدا نہیں کرتے یہ ٹھیک ہے کہ اعلیٰ درجے کا ادب پیدا نہیں ہو رہا ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ ادیبوں کے قلم سے ایسا ادب پیدا نہیں ہوتا جو ملک کی تہذیب کی تعمیر اور اس کے ذہنی ارتقا میں مدد کر سکے۔ لیکن یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ ادب کی تحریکوں کے نقاد مسئلے کے اس پہلو پر بہت کم توجہ کرتے ہیں۔

ادب، ادیب کے دل و دماغ کی کیفیتوں کا آئینہ دار ہوا کرتا ہے اگر ادیب کے دل و دماغ کو سکون میسر نہیں تو جو کچھ وہ کہے گا اس میں بھی اس کے انتشار خیال کا عکس نظر آئے گا۔ اگر ادیب کا ماحول سازگار نہیں تو اس کا ادب بھی ملک کے ذہنی ارتقا کے لئے سازگار نہیں ہو سکتا۔

ایک طاقتور اور موثر ادب انقلابوں کی گود میں پیدا ہوا کرتا ہے یا پھر وہ کسی ملک کی خوش حالی اور امن و امان کے ماحول میں سرسبز ہوتا ہے۔ ہندوستان میں آزادی کا انقلاب کچھ اس طرح آیا کہ سماج کا قدیم نقشہ بدستور قائم رہا ہے۔ اور انقلاب کا ہاتھ اس قدیم شیرازہ کو درہم برہم نہ کر سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زندگی سیاسی آزادی کے بعد بھی ان ہی قدیم سانچوں میں ڈھلتی رہی جن کے جمود میں غلامی کا دور گزرا تھا۔ ملک کا اقتصادی اور معاشی ڈھانچہ بدستور قائم رہا۔ صنعتی ترقی کی کوششیں بھی سرمایہ داری کے اثر سے آزاد نہ ہو سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ معاشی اور اقتصادی قدریں وہی رہیں جو قدیم سماج کے زیر دست چلتے زیر دست ہی رہے۔ ان ہی سماجی اور معاشی زیر دستوں میں ملکی زبانوں کے ادیب بھی ہیں۔

سیاسی غلامی کے دور میں ملکی زبانوں کو حکومت اور سرمایہ داری کی سرپرستی حاصل نہ تھی۔ آزادی کے دور میں بھی وہ وہیں رہیں جہاں تھیں۔ سوائے اس کے کہ مختلف زبانوں کے درمیان رقابتوں کا ایک ہنگامہ تو برپا ہو گیا جو ذہنی پستی اور تنگ نظری کا نتیجہ ہے لیکن ادب کے ذریعے سے ملک کی ذہنی ترقی کی کوئی تعمیری تحریک پیدا نہیں ہوئی۔ چنانچہ یہ کہنا مبالغہ آمیز نہیں کہ آزادی کے ۱۰ سالہ دور میں کسی زبان نے بھی کوئی اعلیٰ درجے کا ادب پیش نہیں کیا۔ بعض گوشوں میں سنجیدہ ادب کے پیدا کرنے کی جو کوششیں کی گئیں وہ اکثر اس لئے ناکام رہیں کہ ایسے ادب کی قدر کرنے والی ذہنی فضا ملک میں موجود نہیں ہے۔

اہل قلم پر اس صورت حال کا الزام رکھنے سے پہلے ہمیں تقاضائے انصاف سے یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ بھوکے اور فاقہ کش ادیبوں سے ہم کیا توقع کر سکتے ہیں۔

حال میں اتر پردیش کی اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے ایک خاتون ممبر نے یہ شکایت کی کہ ریاست کے بجٹ میں کوئی ایسی مد نہیں رکھی گئی جس سے یہ ظاہر ہوتا کہ حکومت واقعی ملک کے اہل قلم کے لئے سکون قلب سے تعمیری ادب پیدا کرنے کے مواقع پیدا کرنا چاہتی ہے۔ چونکہ آج کل بعض سیاسی اغراض کے تحت ہندی زبان کا پرچار ضروری کہا جارہا ہے اس لئے بجٹ کے ایک گوشے میں ہندی ادب کے لئے کچھ وظائف اور کچھ انعامات کے لئے تھوڑی سی ایک رقم نظر آتی ہے لیکن وہ ریگستان میں ایک چلو پانی سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ کسی بھی ریاستی حکومت کے بجٹ سے یہ بات ظاہر نہیں ہوتی کہ حکومتوں کو ادب کی ترقی کے ذریعے سے عوام کی ذہنی ترقی کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہے۔ مسز مہادیوی ورما نے اپنی تقریر میں کہا کہ موجودہ زندگی کی الجھنوں نے ہمارے ادیبوں کو مایوسی کے اندھیرے میں ڈھکیل دیا ہے۔ آج ہمارے اہل قلم اپنی محنت کے نتائج کوڑیوں کے بھاؤ فروخت کرنے پر مجبور ہیں۔ اور سرمایہ دار پبلشر ان کی معاشی بدحالی سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مسز ورما نے اپنے علم و یقین کی بنا پر دو مثالیں پیش کیں۔

انھوں نے کہا کہ ایک اہل قلم نے ہندوستانی زبان کے لغت کی تیاری میں اپنی عمر کے ۱۰ سال صرف کئے اور بالآخر فاقوں سے عاجز ہو کر وہ مسودہ صرف دو سو روپے میں فروخت کر ڈالا۔ ایک شاعر جب اپنے کلام کے مجموعے کو فروخت کر کے اتنا پیسہ بھی حاصل نہ کر سکا کہ اپنے بیمار بچے کا علاج کرا سکتا تو اس نے ساری عمر کے اس سرمایے کو آگ میں جھونک دیا۔ ہم اگر چاہیں تو ایسی سیکڑوں مثالیں پیش کر سکتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ان ادیبوں کے ادب کا معیار بہت گر گیا ہے۔ لیکن کیوں؟

(الف) ایک ہونہار نوجوان ہے جسے فکر و نظر کی قوت حاصل ہے۔ وہ اپنی پہلی کتاب بہت محنت سے لکھتا ہے اور اسے اونچے معیار کی کتاب بنا کر پھر وہ اسے پبلشر کے پاس لے جاتا ہے۔ اس لئے کہ خود اس کے پاس اس کی طباعت کے وسائل موجود نہیں۔ پبلشر یہ دیکھتا ہے کہ عام مذاق اتنے بلند معیار کی کتاب کو قبول نہ کرے گا اور اس لئے اس کی اشاعت میں منافع بہت کم ہوگا اس لئے وہ یا تو مسودہ کے خریدنے سے انکار کر دیتا ہے یا اسے کوڑیوں کے مول خرید لیتا ہے۔ ادیب بھی جب دیکھتا ہے کہ اس کی محنت کا کافی معاوضہ نہیں ملتا اور پبلشر صرف "سستا" لٹریچر مانگتا ہے تو وہ اسی قسم کا ادب لکھنا شروع کر

دیتا ہے اور اس طرح ادب سے ملک کی تہذیب اور کلچر کے ارتقا میں جو مدد مل سکتی تھی وہ نہیں ملتی۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ آزادی کی ایک آنکھ روشنی سے محروم رہتی ہے۔ یہ کانی آزادی کس طرح اپنے ارتقا کا سفر طے کرے گی ہمیں معلوم نہیں۔ لیکن اتنا ہم جانتے ہیں کہ ملکی لٹریچر کی اس پستی کی وجہ سے ہماری آزادی کی ایک آنکھ بصارت سے محروم ہے۔

جو حال پبلشر اور ادیب کے تعلقات کا ہے۔ وہی حال سرمایہ دار فلم بنانے والے سیٹھ اور سینما کے شاعروں اور ادیبوں کا ہے۔ وہاں بھی سیٹھ صرف بے حساب لگاتا ہے اور وہ کسی فطری تیاری میں کتنا سرمایہ لگائے گا تو اس کو کتنا منافع حاصل ہوگا۔ نتیجہ یہ ہے کہ فلموں میں بھی صالح اور اعلیٰ درجے کا ادب ناپید ہے۔ اور گیتوں اور کہانیوں اور گہانیوں میں جو کچھ لکھا جاتا ہے۔ وہ ایک پست اور رجعت پسند، مخفی اور بدبودار ادب ہے۔ جس نے ملک کی ذہنی زندگی کو ناپاک کر دیا ہے۔

قومی زندگی کے موجودہ نقشے میں تین عناصر ہیں جن پر نظر جاتی ہے۔ حکومت، سرمایہ دار اور عوام۔ سرمایہ داروں کا دل و دماغ اپنی قدیم روایات میں اس طرح پھنسا ہوا ہے کہ ملک کے ذہنی ارتقا کی ضرورت کا کوئی تصور ان کے [illegible] نہیں ہو سکتا۔ عوام جن کی ۹۰ فیصدی اکثریت جاہل اور ان پڑھ ہے ادب اور ثقافت کے مطالب مطالبے اور تہذیبی مسائل کو نہ سمجھ سکتے ہیں نہ سوچ سکتے ہیں۔ اب رہی حکومت سو وہ ملک کی مادی ترقی کے منصوبوں میں ایسی الجھی ہے کہ اس نے خود اپنی آزادی کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ لیکن اقتدار اس کے ہاتھ میں ہے اور عوام کی دولت بھی اسی کے خزانے میں ہے۔ اگر وہ ادب کی ترقی کے اہم مسئلے کو بہت اہم مسئلہ نہ سمجھے گی تو آزادی کی کانی آنکھ میں کبھی بھی روشنی پیدا نہ ہوگی۔

قومی ادب کی ترقی کے لئے اگر کوئی منصوبہ بندی کی جائے اور حکومتوں کو اس طرف زیادہ توجہ کرنے پر آمادہ کیا جا سکے تو اس کا کام تو یہ ہونا چاہئے کہ کاپی رائٹ کا ایسا قانون بنائیں جس میں اہل قلم اور ادیبوں کو ناشروں اور پبلشروں کی لوٹ کھسوٹ سے پوری طرح محفوظ کیا جائے۔ دوسرا کام یہ ہے کہ اہل قلم کی تنظیم کی جائے تاکہ وہ اپنے مفادات کی حفاظت کرنے کے قابل ہوں۔ تیسرا کام یہ ہے کہ اتنا سرمایہ پیدا کیا جائے جس سے اچھے اہل قلم اور ادیبوں کو مالی امداد دی جا سکے تاکہ وہ اپنی معاشی مشکلات سے یکسو ہو کر اعلیٰ درجے کا اور معیاری ادب پیدا کر سکیں۔

حکومت نے صحافت کے حالات کی تحقیقات کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا، حال ہی میں ایک اکیڈمی علم و ادب کے معیار کو بلند کرنے کے لئے قائم کی گئی ہے۔ لیکن جب تک خود اہل قلم کے معاشی حالات کو درست کرنے کی تدابیر اختیار نہ کی جائیں گی۔ قومی زبانوں کے ادب کی ترقی رکی رہے گی۔ روحانیت اور اخلاقیات کے اعلیٰ مقام پر کھڑے ہو کر ایک فلسفہ تو وضع کیا جا سکتا ہے جو روٹی اور بھوک کے مسائل کو کچھ زیادہ قابل اعتنا نہ سمجھے لیکن حقیقت شناسی کے بغیر تعمیر ناممکن ہے۔ ایک کامیاب سیاست دان تو سیاسی کام کر سکتا ہے اس لئے کہ وہ اپنے کام میں اپنا پیٹ بھرنے کی راہیں بھی پیدا کر لیتا ہے، لیکن بیچارہ ادیب چار سطریں بھی نہیں لکھ سکتا جب کہ وہ ان سطروں کا پورا پورا معاوضہ نہیں پا سکے گا۔ یہ مسئلہ ہماری اجتماعی زندگی کا ایک بہت بڑا المیہ ہے۔

اردو زبان اور دیوناگری رسم الخط

(از۔ رسول احمد صاحب)

کسی زبان کے لئے کسی مخصوص رسم خط کا رواج محض ایک تاریخی واقعہ نہیں ہوا کرتا کہ اسے وقتی مصالح کی بنا پر رد و قبول کی حیثیت دی جائے بلکہ زبان کے ارتقا کے ساتھ رسم خط کا گہرا تعلق ہوتا ہے اور اس کا ایک حصہ تک نفسیاتی اثر بھی ہوتا ہے۔ ایک اردو خواں انسان کے لئے اردو رسم خط اپنے اندر جو جاذبیت رکھتا ہے وہ ہرگز دوسرے رسم خط میں ممکن نہیں ہے یہی بات دیوناگری اور دوسرے رسم خطوں کے لئے بھی ہے اور جہاں تک ملکوں اور قوموں کی تعمیر کا سوال ہے یہ اثر اور جاذبیت قطعاً منہ بھی نہیں ہے لیکن اگر کسی چیز کو کوئی حکومت یا لوگ مضر سمجھیں تو اس کا کیا علاج ہے۔ اور آج ہمارے ملک کی جو حالت ہے اس میں کتنی آسانی سے قدامت پرست رجعت پسند جیسے الفاظ زبانوں پر آجاتے ہیں یہ کچھ نہیں معلوم۔ یہاں حقیقت اور اصول اپنی جگہ ہے اور جذبات اپنی جگہ۔ ہو سکتا ہے کہ حقائق اور اصول پر جذبات غالب آجائیں۔ جیسا کہ اکثر ہوتا ہے مگر اس سے حقائق بدل نہیں جاتے۔

حالات نے ادھر چند برسوں سے ایک بحث چھیڑ دی ہے یعنی اردو زبان کے لئے دیوناگری رسم خط کا قبول کرنا۔ کہنے والے اس تبدیلی رسم خط میں اردو زبان کی حفاظت بھی دیکھتے ہیں۔ ہندی والے حضرات اور بعض اردو والے بھی اس میں زبان کے قضیے کا ایک حل دیکھتے ہیں۔ بہرحال جب سے اتر پردیش میں اردو کا مسئلہ منظر عام پر آیا ہے یہ بحث چھڑی ہوئی ہے۔ لیکن جب سوال اردو زبان کی حفاظت کے خیال سے دیوناگری رسم خط کے اختیار کرنے کا اٹھایا جاتا ہے تو قطع نظر اس کے کہ آج اکثریت کے احیائی رجحانات زبان کو بھی رسم خط کے ساتھ فنا کر دیں گے۔ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا دیوناگری رسم خط ان عربی اور فارسی الفاظ کو جو اردو زبان میں مروج ہیں ادا کر سکنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔ باوجود اس کے کہ پچھلے دنوں ز، ض، ق، ت، غ وغیرہ کے لئے ہندی والوں نے دیوناگری رسم خط میں نقطے کا اضافہ کر کے یہ صلاحیت ایک حد تک پیدا کی تھی۔ لیکن یہ صورت محض چند الفاظ تک محدود ہے اور یہاں سوال پوری زبان کا ہے۔

جو کوئی دیوناگری رسم خط سے ذرا بھی واقف ہے اور ساتھ ہی اردو یا دیگر کوئی زبان بھی تھوڑی بہت جانتا ہے اسے یہ معلوم کرتے دیر نہ لگے

ہ دیوناگری رسم خط کے لئے خواہ کیسے ہی دعوے کیوں نہ کئے جائیں ، دیوناگری رسم خط اردو کی ضرورتوں سے خالی نہیں ہے ۔ اور جب اسے مکمل رسم خط کہا جاتا ہے تو اس کے معنی محض ہندی زبان کی حد تک ہیں اور یہ بالکل ویسا ہی دعویٰ ہے جیسا کسی بھی رسم خط کے لئے اس زبان کے لحاظ سے کیا جا سکتا ہے ۔ کون کہہ سکتا ہے کہ اردو رسم خط اردو زبان کے لحاظ سے نامکمل ہے ۔ ہاں ہندی زبان کے لحاظ سے اور خصوصاً جدید ہندی زبان کے لحاظ سے یقیناً نامکمل ہے

باوجود یہ تسلیم کرنے کے کہ اردو اور ہندی اس طرح سے ایک دوسرے سے الگ زبانیں نہیں ہیں کہ ہر لحاظ سے انھیں علیٰحدہ تصور کیا جا سکے حالانکہ ہندی کے حضرات بعض اوقات اس کے لئے بھی مصر معلوم پڑتے ہیں اور اردو زبان کے لئے دیوناگری رسم خط اختیار کر لینے کا ناصحانہ مشورہ بھی دیتے ہیں ۔ اس حقیقت کے مطابق یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ اردو زبان اپنی پوری حیثیت میں دیوناگری رسم خط کے ذریعے ہرگز ادا نہیں کی جا سکتی ہے کیونکہ ایسے الفاظ اردو میں بکثرت ہیں جن کو دیوناگری رسم خط میں لکھا نہیں جا سکتا اور اگر زبان کو محض اپنے سیدھے الفاظ کے ذریعے خیالات کے اظہار ہی تک محدود سمجھ لیا جائے تو زبان کی ایک تہذیبی حیثیت بھی تصور کی جاتی ہے تو اس حیثیت سے کہ اردو زبان اس لحاظ سے بھی دیوناگری رسم خط کے ذریعے محفوظ نہیں رہ سکتی ۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اردو زبان کے لئے اردو رسم خط رکھتے ہوئے اور اسے اولیت کے درجے میں قائم رکھتے ہوئے ایک حد تک اردو زبان کے لئے دیوناگری رسم خط کا استعمال کیا جا سکتا ہے ۔ اور اس صورت میں جبکہ اردو رسم خط اپنی جگہ قائم رہتا ہے ۔ دیوناگری رسم خط کے ذریعے اردو زبان کے مسخ ہونے کا کوئی اندیشہ باقی نہیں رہتا بلکہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس طرح ہندی زبان کیلئے جو آج اپنی شکل بدلتی جا رہی ہے اور ہندی کے نادان دوست ہندی کو جس طرف لے جا رہے ہیں اس پر بھی یہ صورت حال اپنا اثر ڈالے اور اردو اور ہندی دونوں ہی زبانیں اعتدال پر آجائیں ۔

مگر اس کا امکان اسی صورت میں ہے جبکہ اردو زبان کے لئے اردو رسم خط باقی رہے اور وہ اولیت کے درجے پر قائم رہے اور ساتھ ہی دیوناگری رسم خط میں بھی ایک حد تک اردو زبان کے لکھنے پڑھنے کا رواج چل جائے بلاشبہ آج کے حالات میں جبکہ دیوناگری رسم خط میں لکھی جانے والی زبان کو سرکاری زبان کی حیثیت حاصل ہے اور دیوناگری رسم خط اور ہندی زبان حاصل کرنا ہر ہندوستانی کا ملکی اور قومی فرض ہے یہ صورت نہ صرف ممکن ہے بلکہ لازمی ہے ۔

ان ساری مشکلات کو جو اردو رسم خط کو ترک کر دینے پر پیدا ہو جائیں گی اور اردو دیوناگری رسم خط کو اختیار کرتے ہی اپنی وسعت کو کھو کر اس تنگ کوٹھری میں مقید ہو جائے گی جس میں باوجود تنہائی کے اس پر شعوری اور غیر شعوری طور پر حملے بھی ہوتے رہیں گے جس سے وہ لازمی طور پر اکثریت کے ادبانی رجحان کی بھینٹ چڑھ جائے گی ۔ اگر ہم اس امر کو نظر انداز کر کے اپنی بحث محض ... رسم خط اور اردو زبان کی تحریر تک ہی محدود کر دیں اور زبان کے لحاظ سے دیوناگری رسم خط کا جائزہ لیں تو جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے دیوناگری رسم خط ہرگز اردو زبان کو ادا کر سکنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور اردو الفاظ کو دیوناگری رسم خط میں لکھتے ہوئے ہمیں بہت جلد اس نقص کا پتہ چل جاتا ہے ۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند اردو الفاظ دیوناگری رسم خط میں لکھ کر ان کا رسم خط کے لحاظ سے اردو رسم خط میں تلفظ دے دیا جائے تاکہ بآسانی سمجھا جا سکے کہ دیوناگری رسم خط کے مکمل ہونے کے جو لوگ مدعی ہیں اس کے کیا معنی ہیں اور اردو یہ الفاظ اپنے صحیح تلفظ کے دیوناگری رسم خط میں کس حد تک محفوظ رہتی ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہاں اردو اور ہندی کی اس عام حیثیت سے بحث نہیں ہے جس کو اردو یا دیوناگری کسی بھی رسم خط میں لکھا جا سکتا ہے بلکہ یہاں اردو زبان کو مکمل دیوناگری رسم خط کے ذریعے محفوظ اور باقی رکھنے کے متعلق خیالات سے ہے ۔ اور اسی خیال سے یہ چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں :-

اردو رسم خط	دیوناگری رسم خط	تغیر شدہ تلفظ
رسم خط	रस्म खत	رَسے خط
رہبر	रहबर	رَہ بَر
بہتان	बोहतान	بُوہتان
بہتات	बोहतात	بوہتات
شاعر	शायर	شایَر
شعر	शेर	شیر
شاعری	शायरी	شایری
اُمرا	ओमरा	اُومرا
شعرا	शोअरा	شوأرا
محتاج	मोहताज	موہتاج
صبح	सुब्हा	سُبُّہا
ظہر	ज़ोहर	ظوہر
غسل	ग़ोस्ल	غوسل
نعمت	नेअमत	نےامت
قیامت	कियामत - केयामत	قیامت ۔ قےیامت
قواعد	क़वायद	قوایَد
قاعدہ	क़ायदा	قایدا
فائدہ	फ़ायदा	فایدا
خائف	ख़ायफ़	خایف
لائق	लायक़	لایق
نائب	नायब	نایب
خیال	ख़ेयाल - ख़ियाल	خیال ۔ خےیال
تحفہ	तोहफ़ा	توہفا

جیسا کہ کہا جا چکا ہے یہ محض چند مثالیں ہیں جو یہ واضح کرنے کے

لئے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دیوناگری رسم خط میں اردو زبان کی کیا شکل ہو جاتی ہے۔ باوجود اس کے کہ اگر کوئی یہ رائے رکھتا ہو کہ اردو زبان دیوناگری رسم خط کے ذریعہ محفوظ رہ سکتی ہے تو اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔ اگر وہ شخص ذرا بھی غور کرے گا کہ وہ اردو زبان کے لئے اردو رسم خط کو ترک کرکے اس کی جگہ دیوناگری رسم خط کو دیئے جانے کے حق میں ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اور نہ فرقہ پرستی اور رجعت پسندی کے الفاظ سے ذکر انصاف و معقولیت کو ترک کر سکتا ہے۔

ہندوستانی پرچار سبھا
وردھا (ایم پی)

کیمبرج یونیورسٹی میں اردو کا شعبہ

بھارت میں اردو کے تحفظ کے لئے جو ہو رہا ہے وہ (ایک) بلکہ ایک منظم جدوجہد ہے اور جو احباب اس کوشش میں حصہ لے رہے ہیں وہ اپنا فرض نہایت انہماک سے ادا فرما رہے ہیں۔ خدا انہیں کامیابی عطا فرمائے۔ میں آپ کو اس وقت دوسری طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ میری اپیل پر غور فرمائیں گے۔

آپ کو غالباً معلوم ہوگا کہ انگلینڈ کی کیمبرج یونیورسٹی نے ایک عرصے سے اردو شعبہ کھول رکھا ہے جس میں اردو سے دلچسپی رکھنے والے یورپین طالب علم تحصیل اردو میں کامیاب اور نمایاں حصہ لے رہے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے تو ہندوستان میں درجنوں انگریز ایسے تھے جو اردو ادب سے نہ صرف واقف تھے بلکہ اردو کے بہترین شاعر تھے۔ جب انگریزی زبان نے ہندوستان میں ترقی کی تو ایسے ادیب اور شاعروں میں بڑی حد تک کمی ہو گئی۔ اس وقت مسٹر پامر کیمبرج یونیورسٹی اردو کے نہایت اچھے شاعر اور ادیب ہیں اور صاحب دیوان بھی ہیں۔ ان کے علاوہ پندرہ بیس یورپین اور بھی ہیں جو اردو میں شعر کہتے ہیں اور ان کا کلام اردو شاعری میں اہمیت رکھتا ہے۔

کیمبرج یونیورسٹی لائبریری میں اس وقت اردو ادب کی پانچ چھ سو کتابیں ہیں جن میں سال گذشتہ زندہ دلان پنجاب نے کئی ہزار روپے صرف کرکے معقول اضافہ کیا ہے چونکہ اردو ادب کے کلاسیکل بازار پنجاب میں نہیں ہیں۔ یہ دہلی اور لکھنؤ میں ہیں اس لئے ادب قدیم کا وہ مجموعہ جو دلی اور لکھنؤ میں دستیاب ہو سکتا ہے فراہم نہ ہو سکا۔ اس کی اہم ضرورت ہے کہ ہم قدیم ادب کی کتابوں سے کیمبرج لائبریری کی زینت میں اضافہ کریں اور اس طرح اپنی پیاری زبان کے ادب کو یورپ کے طالب علموں سے روشناس کرائیں۔

لکھنؤ۔ دلی۔ الہ آباد۔ حیدرآباد۔ علی گڑھ۔ اعظم گڑھ

کے ادیب۔ اہل مطبع۔ ناشرین۔ کتب خانوں کے مالک۔ ان سب کا یہ اہم فرض ہے کہ وہ نیچے دی ہوئی فہرست میں دی ہوئی کتابوں کو فراہم کرکے کیمبرج لائبریری [illegible] کو جلد از جلد بھیج دیں۔ اگر کوئی تنہا ذات اس کا بار نہیں اٹھا سکتی تو یہ کام چندہ سے پورا کیا جا سکتا ہے۔ اہمیت کے لحاظ سے یہ از حد قابل توجہ ہے۔

قدیم ادب کی جن کتابوں کی ضرورت ہے وہ شعرائے اردو [illegible] کی تاریخ اور تحقیق پر مشتمل ہیں جن سے دلی لکھنؤ الہ آباد علی گڑھ [illegible] اعظم گڑھ کے کتب خانے پُر ہیں۔ قصے کہانیوں کی ضرورت نہیں ہے۔

ہمارے مشاعرے بڑے کامیاب ہوتے ہیں [illegible] اچھی صورت [illegible] ہیں اور دو روپے جو اتفاقاً شاعروں [illegible] اور دارات میں چند گھروں سے دوستوں کے نغمہ باریوں سے [illegible] ہوتے ہیں اس اہم کام میں صرف ہوں تو یقیناً اردو کی بہترین خدمت ہو سکتی ہے۔

ہمارے صوبے اور بھارت کے تمام اردو اخبارات سے مخلصانہ استدعا کرتے ہیں کہ وہ ہماری اس اپیل کو یا اس کے خلاصہ کو شائع کرکے اردو دانوں کو اس ضروری خدمت کی طرف متوجہ کریں۔ ہر شہر میں چند سرگرم کارکن تیار ہوں اور چندے کرکے ادبی کتابیں کیمبرج یونیورسٹی۔ لائبریری اردو سیکشن انگلستان روانہ فرمائیں۔

کتاب بھیجنے کا پتہ یہ ہے:۔

کیمبرج یونیورسٹی۔ لائبریری۔ اردو سیکشن۔ کیمبرج (انگلستان)

معتبر اطلاع ہے کہ امریکہ میں بھی شکاگو یونیورسٹی ایسا ہی انتظام کرنے والی ہے

کیمبرج یونیورسٹی لائبریری انگلستان میں جو اردو کی کتابیں ہیں ان میں مخصوص کتابیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) باغ و بہار ۲۔ آرائش محفل ۳۔ فسانۂ عجائب ۴۔ کلیات سودا ۵۔ کلیات ناسخ ۶۔ کلیات میر ۷۔ دیوان تاباں ۸۔ دیوان آتش ۹۔ منتخب داغ ۱۰۔ طوطا کہانی ۱۱۔ اردوئے معلیٰ ۱۲۔ دیوان غالب ۱۳۔ رسائل شبلی ۱۴۔ شعر العجم ۱۵۔ سیرت النبی ۱۶۔ سوانح عمری مولانا روم ۱۷۔ رباعیات حالی ۱۸۔ مراۃ العروس ۱۹۔ توبۃ النصوح ۲۰۔ ابن الوقت ۲۱۔ فسانۂ آزاد کی چاروں جلدیں ۲۲۔ نیرنگ خیال ۲۳۔ قصص الہند ۲۴۔ مسدس حالی ۲۵۔ چہار درویش ۲۶۔ قواعد اردو ۲۷۔ رویائے صادقہ ۲۸۔ آب حیات ۲۹۔ یادگار غالب ۳۰۔ فرحت اللہ بیگ کا مشاعرہ ۳۱۔ بانگ درا ۳۲۔ اقبال کا تمام کلام

"ہندستانی" اور دوسری ہندستانی زبانوں کے ماخذ

اقتباس از

(مرتبہ مسٹر مدن گوپال)

گذشتہ سے پیوستہ

البیرونی یا دوسرے سیاحوں نے اس کی مخالفت میں کچھ بھی کہا ہو ہندوستان ہمیشہ بہت سی زبانوں کا ملک رہا ہے۔ اشوک کے زمانے میں ہم تین مختلف زبانیں تھیں۔ ایک مشرقی دوسری مغربی اور تیسری شمال مغرب کی سرحد وا پر بولی جاتی تھی۔ ہیونتسانگ نے کئی بولیوں کے وجود کا ذکر ملتا ہے۔ اس عبارت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہمیں اتنی کہ جو بولیاں ملتی ہیں ہندوستان مختلف بولیوں سے بھرا نظر آتا ہے۔ ہر ایک کا الگ علاقہ ہوتا تھا۔ کبھی بھی پورے ہندوستان پر کسی ایک بولی کو قومی زبان کی حیثیت ممکن ہے بہت تھوڑے عرصے کے لئے کسی زبان کو لوگوں نے مان لیا ہو مگر ایسا بھی بہت کم ہوا تھا، حاصل نہیں رہی۔ یہاں تک کہ پالی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ہمارے لئے اس وجہ کو جاننا ضروری ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوتا تھا۔ ایک ہی دلیل نظر آتی ہے۔ جیسے ہی کسی نے تھوڑی سی ادبی حیثیت حاصل کی وہ ماہرین صرف و نحو کے ہاتھوں میں پڑ گئی اور آہستہ آہستہ بات چیت کے الفاظ سے دور ہوتی گئی۔ بولی سے اس کی قوت ختم ہو گئی اور آخرکار وہ مر گئی۔ کیا آج کل ہندی ہندی اسی سمت میں نہیں جا رہی ہے؟ جہاں تک کہ ہندوستان پورے ہندوستان کی زبان صرف ایک بار ایک حکومت کے ماتحت آیا تھا، یعنی قریب موریوں کی حکومت تھی اور اس وقت ایک ہی ریاست رائج تھا۔ بدقسمتی سے اشوک کی موت کے بعد سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور پالی کو زیادہ مدت تک دوسری بولیوں پر کسی سیاسی فوقیت حاصل نہیں رہی۔

یہاں اس کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ اشوک کے فرمان سے دو باتیں صاف ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اس زمانے میں تین خالص بولیاں تھیں۔ دوسرے قانون اور فرمان کے الفاظ میں فارسی زبان کے اثرات کو ملا دیا ہے۔ قانون میں پرانے زمانے کے اثرات ملتے ہیں جیسے دیپی فارسی لفظ نوشتہ (دبیر، دپتی) سے آیا ہے لفظ دیپی دور ہو ..... اس فارسی اثر کو سمجھنا آسان ہے کیونکہ قدیم ہندوستانیوں پر بہت سی نفرت کی وجہ سے اپنے ملک کی تاریخ بھی بھول بیٹھے ہیں۔ تقریباً دو سو سال تک ..... سے تمام سے نصف ..... شمال مغربی ہندوستان اور پنجاب کے مغربی حصے پر فارس کی حکومت رہی تھی ..... ہندوستان کے ..... زمانہ تھا اور جبکہ عظیم گپتوں کا تسلط بھی راوی کے آگے کبھی نہ ہو سکا تھا، مدینہ کی فارسی حکومت کے اثرات مغربی زبانوں اور سورسینی پر پڑنا لازمی تھے کیونکہ ہندستانی براہ راست سورسینی سے نکلی ہے۔ اس لئے ہم کو یہ حقیقت بھولنی نہ چاہیئے کہ پچیس صدیوں سے ہندستانی کا تعلق فارسی سے بڑا خوشگوار رہا ہے۔ تقریباً تمام ہندوستانی کے سہل الفاظ کا ماخذ فارسی یا ترکی ہے۔ یہ کون تصور کر سکتا ہے کہ ایسے معمولی الفاظ جیسے ٹھاٹ فارسی کے ..... سے اور ٹھاکر پرانی ترکی لفظ ..... سے آئے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمارے روٹی اور ..... الفاظ بھی ترکی ہیں۔

موریہ کے چھ سو سال بعد گپت عہد آیا یعنی ۳۲۰ء سے ۵۰۰ء تک۔ اور اس کے ماتحت ملک کا بہت بڑا حصہ آگیا تھا۔ پالی اور دوسری پراکرتیں بولنے والی زبانیں بے سہارا تھیں کیونکہ ماہرین صرف و نحو نے بڑی کامیابی سے انہیں ختم کر دیا تھا۔ اس وقت تک نئی بولی جانے والی زبان اپ بھرنش کو ادبی حیثیت نہیں حاصل ہو سکی تھی۔ اس لئے وہ سنسکرت کی سرپرستی کرتے رہے دوسرے اس زمانے میں زندگی کے ہر شعبے پر برہمنیت تاثیر ہوتی جا رہی تھی۔ ..... سرپرستی اور یونانی تہذیب (جس کا زندگی کے شعبوں پر اثر تھا) کی وجہ سے سنسکرت کو وہی درجہ حاصل ہو سکا جو اس سے پہلے صرف پالی کو حاصل تھا۔ ایک مردہ زبان ہونے کی وجہ سے وہ صرف اہل علم کی زبان ہو سکی اس لئے اس میں کوئی اپیل نہ تھی اور وہ پھیل نہ سکی تو بھلا وہ کسی زندہ زبان کی جگہ کیسے لے سکتی تھی۔ اس زمانے کے سنسکرت ڈراموں سے تین باتیں معلوم کی جا سکتی ہیں۔

(۱) صرف راجے مہاراجے، مصاحبین، کنیزیں اور برہمن سنسکرت بولتے تھے باقی سب پراکرت بولتے تھے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ مصاحبین اور کنیزیں بھی سنسکرت بولنے والے اونچے طبقے میں شامل تھیں اس سے اس زمانے کی سماجی حالت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ برہمن اس کو دیوتاؤں کی زبان سمجھا کریں۔ شاید یہ کہنا ٹھیک ہوگا کہ یہ طوائفوں اور برہمنوں کی زبان تھی جو قدیم مشرقی تمدن کے دو ستون سمجھے جاتے تھے۔

(۲) اس زمانے میں بھی کئی بولیاں تھیں۔ ایک ہی ڈرامے میں اداکار گیارہ مختلف بولیاں استعمال کرتے تھے۔

(۳) جو پراکرت ان ڈراموں میں سب سے زیادہ استعمال کی گئی تھی وہ سورسینی ہے اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چھٹی ساتویں صدی میں بھی

اسے اہمیت حاصل ہو چکی تھی۔ سورسینی اپبھرنش سنہ ۸۰۰ء سے سنہ ۱۲۰۰ء یا سنہ ۱۳۰۰ء تک تمام شمالی ہند کے دانشوروں کی زبان ہو گئی تھی۔

ہیم چندر (سنہ ۱۰۸۸ء سے سنہ ۱۱۷۲ء) نے اپنی قواعد میں مغربی اپبھرنش کی جو مثالیں دی تھیں وہ اس زمانے کی زبان کو ہندوستانی کی سمت واضح اشارے کرتی تھیں۔ سنہ ۱۲۰۶ء میں قطب الدین نے دہلی کو دارالسلطنت بنایا تھا۔ امیر خسرو جو ہند کا طوطی تھا اس زمانے میں موجود تھا۔ ہندوستانی کو سات صدیاں (یعنی سنہ ۱۱۰۰ء سے سنہ ۱۸۰۰ء تک) نشوونما میں لگیں۔ اس کو بہت بلند درجہ سیاسی تاریخ اور تہذیبی تحریکوں کے نتیجے میں ملا ہے۔ ہندوستانی کلچر کی بنیاد دیہاتی کلچر پر ہے۔ وہ شخص جو ہل چلاتا ہے اور وہ عورت جو اس کے لئے کھانا پکاتی ہے اصل میں یہی دونوں پارٹیاں زبانوں کو زندگیاں عطا کرتی ہیں۔

یہ بتایا جا چکا ہے کہ مغربی ہندی کی مختلف بولیوں کا ماخذ سورسینی کی اپبھرنش کا مرہون منت ہے۔ جدید زبانوں میں جو زبان پہلے ادبی زبان بنی وہ راجستھانی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ راجپوتی سالاروں میں آپس میں بڑی رنجشیں تھیں تو انھوں نے اپنی قصیدہ خوانی کے لئے مقامی لوگوں کی سرپرستی کی جو آسان زبان میں رعایا کو ان کے حالات سمجھاتے تھے۔ سب سے پہلی منظوم کہانی پرتھوی راج راسو ہے جس میں وہ حالات لکھے ہیں کہ پرتھوی راج اپنی منگیتر کو کیسے لے گیا تھا۔ یہ ہندی ادب کا بہادرانہ عہد کہلاتا ہے جو سنہ ۱۰۵۰ء سے سنہ ۱۳۲۵ء تک رہا تھا۔ مغربی ہندی کی پہلی تالیف میں بہت سے فارسی الفاظ ملتے ہیں جو ہندوستان اور فارسی کے قدیم تعلقات کا لازمی نتیجہ تھا۔

ہندو انیسویں صدی کے نصف ہی سے مسلمانوں کے فتوحات کو ایک عذاب جان سمجھنے لگے تھے۔ اس زمانے میں ہندو فرقہ پرستی کی ابتدا ہوئی تھی۔ ہر ایک ہندو مصلح نے کسی نہ کسی طرح ہندوؤں میں پھیلی ہوئی برائیوں کو مسلمانوں کے حملوں کے نتائج سے تعبیر کیا ہے۔ انگریزوں نے اپنے مفاد کے پیش نظر ان رجحانات کی ہمت افزائی کی تھی۔ تقسیم ہند اور اس کے بعد کے نتائج اور دونوں ملکوں کے خراب تعلقات نے طرفین میں اور بھی نفرت پھیلا دی ہے۔ لیکن اگر کوئی دور اندیشی سے کام لے تو مسلمانوں کی آمد کو جیسی ہونی خوشخبری سمجھے گا۔ اور مسائل کو چھوڑتے ہوئے یہ تو ماننا پڑے گا کہ ہندوستانی تاریخ کے تاریک عہدوں کا خاتمہ ہو گیا جبکہ علم اور کلچر صرف چند کے لئے مخصوص تھے اور یہ دولت عام نہیں ہوتی تھی۔ خواہ آج کے برہمن مورخ کچھ بھی کہیں یہ حقیقت ہے کہ قدیم ہندو عہد میں تعلیم صرف چند منتخب افراد کے لئے تھی اور وہ ان کی ہی ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ چنانچہ برہمنوں کو سنسکرت سے جذباتی لگاؤ ہو گیا اسی لئے کہ تین ہزار سال تک وہ ہندو عقائد اور ادب کے نگراں رہے۔ حد یہ ہے کہ نئی ہندو سوسائٹی اس طرح بنائی گئی ہے کہ زیادہ توجہ سنسکرت ہی پر دی گئی جس کو عقائد کی زبان بنا دیا گیا اور غلط فہمی یہ ہے کہ دوسری زبانیں سنسکرت ہی سے خراب ہو کر بنی ہیں یا ہنگامی ضرورت کے لئے بنی تھیں اس لئے ان میں تعلیم حاصل کرنا بے سود ہے۔ اس سے شمالی ہند یا ہندوؤں کے ادبی زندگی کے جمود کا پتہ چلتا ہے۔

درمیانی علاقہ جب تھوڑا سا پھیلا تو اس کو آریہ ورت کہتے تھے اور جب چاروں طرف پھیل گیا تو اس کو ہندوستان کہتے تھے۔ اس میں گنگا اور جمنا کی وادیاں شامل تھیں اور مشرق میں وہ دریائے کوسی تک پھیلا ہوا تھا۔ راجپوتانہ، مرکزی ہند (بندیلکھنڈ اور بگھیلکھنڈ) اور وادی نربدا سے کھنڈوا تک اور مرکزی صوبوں کے شمالی حصے شامل تھے اس میں پنجاب نہیں شامل ہے گو کہ وہاں کے کچھ شہروں کی آبادی ہندوستانی بولتی ہے۔ خاص فرق یہ تھا کہ قصبات میں فارسی الفاظ بہ نسبت دیہاتوں کے زیادہ بولے جاتے تھے۔ مجھے اس فرق کو واضح کرنے دیجئے۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے تک ہندوستانی ان تمام علاقوں میں بولی جاتی تھی جو ہندوستان میں شامل تھے جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔ کچھ عرصے بعد اس اصطلاح (ہندوستانی) کو محدود کر دیا گیا اور اس میں وہی بولی شامل تھی جو دہلی اور اس کے قرب و جوار میں استعمال ہوتی تھی۔ ہندوستانی کو اسی محدود معنوں میں اس کتاب میں استعمال کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے بادشاہوں نے حکمت عملی کے مدنظر دہلی کے اطراف ہی کو دارالسلطنت بنایا تھا اور یہ سلسلہ بغیر کسی وقفے کے چھ سو سال سے جاری ہے۔ یہ ایک تنہا واقعہ دہلی کی بولی کو تمام ہمسائی بولیوں پر فوقیت دینے کے لئے کافی تھا جو ہندوستان (جس میں وہ علاقے شامل ہیں جن کا ذکر کیا جا چکا ہے) میں بولی جاتی تھیں اس طرح یہ لنگویا کی بین الاقوامی بن سکی تھی۔ جیسا کہ ہم بعد کو دیکھیں گے کہ اس کا ارتقاء اتنا سیدھا سادہ تھا ہندوستانی کے بارے میں یہ بہت اہم نکتہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ کھینچ تان کے بھی اس کو دہلی بازار میں مختلف بولی جانے والی زبانوں کا مرکب نہیں کہا جا سکتا۔ اس سراسر غلط خیال کو وہی لوگ مان سکتے ہیں جنھوں نے اس کے سورسینی سے نکلنے والے ارتقائی حالات کے مطالعہ کی زحمت گوارا نہیں کی ہے۔ اس غلط خیال کے مبلغ اردو کے مسلمان ادیب تھے۔ اور بنارس تو مسلمانوں کا نام دے کر اس کو مسلم زبان کہنے کا موقع ہی ڈھونڈھ رہا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہی زبان سورسینی اپبھرنش کی جائز وارث ہے اور اس کی تشکیل میں صدیاں

گزری ہیں۔ ہندوستان کے سب سے بڑے ماہر لسانیات ڈاکٹر سونیتی کمار چٹرجی کے قول کے مطابق سور سینی اپبھرنش (جس میں سے ہندوستانی نکلی ہے) سنہ ۸۰۰ء سے سنہ ۱۲۰۰ء تک پنجاب سے بنگال اور نیپال سے مہاراشٹر تک حکومت کی تھی اور یہی دانشوروں کی زبان تھی۔ وشنو مت اور جینیت کی تبلیغ اسی میں ہوئی تھی۔ برج جو حضرت عیسیٰ کے زمانے سے کر صدیوں کی پراکرتوں میں سب سے زیادہ شستہ تھی وہ بھی سور سینی کے وارثوں میں سے ایک تھی۔ یہ وہی برج تھی جو گنگا کی اوپری وادی کی اہم ادبی بولی تھی اور گنگا کی اوپری وادی ہی سب سے زیادہ شاداب تھی۔ یہاں تک کہ مسلمان بھی اس پر فریفتہ ہو گئے تھے۔ برج کے شاعر ہر مسلم دربار میں موجود تھے اکبر اعظم تو اس میں شاعری بھی کرتا تھا حتیٰ کہ اورنگ زیب اس کی شاعری کو پسند کرتا تھا۔ ہندوستانی اس کے مقابلے میں کوئی بھی امکان نہ رکھتی تھی لیکن آہستہ آہستہ سیاسی، تجارتی اور فوجی ضروریات نے اس کو (ہندوستانی کو) بہت آگے بڑھایا۔ اس مرحلہ کو طے کرنے میں سات صدیاں لگ گئیں یعنی سنہ ۱۱۰۰ء سے ۱۸۰۰ء تک۔ آہستہ آہستہ یہ ایک [illegible] بن گئی ہے۔ کانگریس کی عداوت کے باوجود وہ دن دور نہیں ہے جبکہ یہ تمام بولیوں اور شاید زبانوں پر فوقیت حاصل کر لے گی۔ اس کو یہ درجہ ملک کی سیاسی تاریخ اور دہلی کے دارالسلطنت ہونے کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ آخر کار ہندوستانی بھی تو برج ہے جس کو پنجابی طریقے سے ادا کیا جاتا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کو کیوں 'کھڑی بولی' (مردانی زبان) کہا جاتا ہے۔ یہ ایک 'آ' اور برج ایک 'او' زبان ہے۔ ہم ہندوستانی میں 'میرا بیٹا ہے' کہتے ہیں جبکہ برج اور راجستھانی میں 'میرو چھوا ہو ہے'۔ اس کی مردانگی کا ایک پہلو اور بھی ہے وہ یہ ہے کہ تمام ہندوستانی زبانوں میں یہی ایسی ہے جو غیر ضروری قواعدی اصولوں کی غلام نہیں ہے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس کی قواعد ایک پوسٹ کارڈ پر لکھی جا سکتی ہے۔

دوسرا اہم نکتہ ہندوستانی کے بارے میں یہ ہے کہ اس کی آوازیں صحیح اور صاف ہوتی ہیں۔ اس کے صرف دس حروف علت کی آوازیں ہیں۔ اس کے حرف علت اور ہم آہنگ کی آوازیں خالص ہندوستانی ہیں اور وہ بھی آریہ کے حملے سے پہلے بن چکی تھیں۔ اس نے ابھی تک تمام دوسری زبانوں کی آوازوں کو اپنے میں داخل نہیں ہونے دیا ہے جس میں آریائی سنسکرت، فارسی اور انگریزی شامل ہیں اور آج بھی اسکالرس اور سائنس دانوں اور کانگریس حکومت کی کوششوں کے باوجود دوسری آوازیں داخل نہیں ہو سکی ہیں۔ ہندوستانی جامع بھی ہو سکتی ہے اور تفصیلی بھی۔ یہ ایک مردانی زبان ہے۔ "مردانی اصطلاح" کر صحیح معنوں میں ——— اس کی آسان مختصر اور یک رکنی الفاظ کی خوبیوں کے علاوہ اس کا سیکھنا بڑا آسان ہے کیونکہ کسی اسم یا صفت کے ساتھ "کرنا" لگا کر اسے فعل بنایا جا سکتا ہے۔ جیسے "مدد کرنا" اور "کالا کرنا"۔

میرا یقین ہے کہ تمام انڈین زبانوں میں ہندوستانی سب سے زیادہ فصیح ہے۔ ایک مردانی اور جہانگیر زبان ہونے کی وجہ سے اس نے دوسری زبانوں سے (جن سے اس کا میل جول ہی) الفاظ، محاورات روزمرہ اور مقولے اپنائے ہیں۔ یہ ہندی کی طرح نہیں ہے جس کے ہمزاد عظیم دیویدی نے تمام محاورات اور مقولوں کو الگ کر دیا ہے۔ جن سے ہندوستانی معمور ہے۔ یہ بے مثال حسین زبان بنارسی فیکٹری کے حرارت خانے کی پیداوار نہیں ہے۔ اس کی نمو میں صدیاں ایک تاریخی دھارے کی حیثیت سے گزری ہیں۔ تاریخی حقائق اور ان کے زبان پر اثرات کو کسی خود رائی کی وجہ سے ختم نہیں کیا جا سکتا خواہ کانگریسی برہمنی حکومت ہی کیوں نہ ہو۔

ہندوستانی دہلی اور اس کے اطراف کے لوگوں کی قدرتی زبان تھی جو بڑی تعداد میں بازار میں آتے تھے۔ یہ بازار کی زبان تجارت اور کامرس کی زبان بن گئی۔ یہیں سے تجار اور سالارانِ حکومت کے ذریعہ ملک کے کونے کونے میں پہونچ گئی تھی۔ ہندوستانی کی تشکیل میں تجارت کے رول کو مسلم ادیبوں نے بہت کم اہمیت دی ہے اس لئے کہ وہ اس کو اردو کہتے ہیں یعنی کیمپ کی زبان۔ ان کے خیال میں یہ کیمپ ہی میں پیدا ہوئی تھی۔ یہ بات صداقت سے بہت دور ہے۔ بنیادی طور سے ہندوستانی ایک ایسے لوگوں کی تجارتی زبان ہے جو مختلف ناقابل فہم انڈو ایرانین زبانیں بولتے تھے۔ مسلمانوں کے عہد میں بھی تجارت ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی اس لئے حقیقت میں یہ ایک ہندو زبان ہے۔ مسلمانوں کا صرف اس وجہ سے حق ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے ادب میں اس کو استعمال کیا اور اردو کا نام دیا۔

ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ اس کے پاس ایسی زبان ہے جو ملک کے کسی بھی گوشے اور ہر طبقے کے عام آدمی کی سمجھ میں آسکتی ہے اور زبان ہی کے بل کے ذریعہ سے کوئی بھی شخص ملک کا سفر کر سکتا ہے۔ اس سے پہلے صرف پڑھا لکھا طبقہ پالی، سنسکرت یا فارسی کی مدد سے سفر کر سکتا تھا۔ ہندوستانی کے چاروں طرف عام ہونے نے اس خواب اور آرزو کے پورے ہونے کے امکان کو روشن کر دیا ہے کہ تمام ہندوستان کے لئے ایک مشترک زبان ہو تاکہ مختلف لوگ ایک دوسرے کے قریب آسکیں۔

ہمیں آزادی کے وقت مغل سلطنت کا احسان نہ فراموش کرنا چاہئے کہ جس نے خواب کو حقیقت بننے میں مدد دی ہے ہندوستانی صاف

طور سے محبت کی زبان ہے جو دو تہذیبوں کے اشتراک سے عمل میں آئی ہے۔ حیاتیاتی اصول جو مخلوق نسلوں پر لاگو ہیں، زبانوں کے اختلاط پر بھی استعمال ہو سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ صرف مقداری اعتبار سے ہی نہیں بلکہ معنوی اعتبار سے مالا مال کر دیتا ہے۔ برہمن؟ برہمن ہی نہیں رہتا اگر وہ مختلف ذاتوں کی شادی بیاہ میں دخل اندازی نہ کرے خواہ وہ زبانوں ہی کی کیوں نہ ہو۔ اسی لئے وہ محبت کی زبان کو تباہ کرنا چاہتا ہے اور اس جگہ کو نفرت کی زبان (یعنی ہندی) کو دینا چاہتا ہے۔

مسٹر ایس۔ کے چٹرجی کے خیال میں زبان کے معاملے میں پنجابی کی برتری کو خاموشی سے تسلیم کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پنجابی "تلفظ کو زیادہ شستہ سمجھا گیا تھا۔ آج بھی ایسا ہی ہے گو کہ بہت سے لوگ یہ رائے نہیں مانیں گے۔" پنجاب کا اثر ہونے کی یہ وجہ ہے کہ ہر زمانے میں جب بھی حملہ آور ہندوستان میں داخل ہوئے ہیں تو وہ شمال مغرب سے ہو کر پنجاب پر حکومت کو مستحکم کرتے تھے۔ اور پھر وہیں سے فوجوں (جس میں کہ زیادہ تر پنجابی بھرتی کئے جاتے تھے) کے ذریعہ ہندوستان کے دوسرے حصوں پر چڑھائی کرتے تھے۔ آریائی زمانے میں ہندوستان لسانی طور سے ادلیہ (شمال مغرب) مدھادیس (درمیانی علاقہ) اور پراسیا (مشرقی) میں تقسیم تھا اور ویپار کا سیکلی برھنا' میں لکھا ہے کہ ادلیہ ہی کی بولی معیاری بولی سمجھی جاتی تھی۔ یہاں تک کہ مغلوں اور انگریزوں کے زمانے میں بھی فوج کا بہترین حصہ پنجاب ہی سے بھرتی کیا جاتا تھا۔ بقول چٹرجی "پنجابی بہادر لوگ ہیں اور یہ انھیں کا اثر ہے کہ شمالی ہند کی سب سے پرزور زبان ہے۔" حقیقت میں یہ تمام باتیں بنارس والوں کے لئے سخت قسم کی بدعت ہیں۔ یہ شمالی (ادلیہ) کی خاموش خوبصورت دوشیزہ بالغ ہو کر درمیانی علاقہ کی ایک محبت کرنے والی ماں بن گئی ہے اور اپنی محبت اور لیاقت کی وجہ سے آج یہ پندرہ کروڑ انسانوں کی زبان بن گئی ہے۔ ہندو ضابطہ پرست حکومت کی سرپرستی میں بنارس کے پروہت اس اچھی ماں کو اونچے معیار کی نقاب ڈال کر گلا گھونٹنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم لوگوں کو 'عالم مصلح' کا غلام بنایا جا رہا ہے۔" اس کا سب سے بڑا تصور یہ ہے کہ غیر برہمنی ہے یعنی جس کا بولنا، سمجھنا اور سیکھنا آسان ہے ظاہر ہے طفیلی کو ایسی زبان نہیں پسند آ سکتی خواہ یہ ملک کے لئے ٹھیک ہی کیوں نہ ہو، اسے اس کی پروا نہیں ہے۔

امیر خسرو کو (۱۲۵۳ء سے ۱۳۲۵ء تک) جس کو بجا طور سے 'عندلیب ہند' کا نام دیا گیا تھا۔ ہندی اور اردو کے اسکولوں کا پہلا بڑا ہندوستانی ادیب تسلیم کرتے ہیں۔ وہ فارسی کا پہلا بڑا شاعر تھا جس نے ہندوی بولیوں میں نظمیں لکھی تھیں۔ اس نے ہندی کی روزمرہ کو برج (جو ادبی بولی تھی) سے ملایا تھا۔ اسکی کچھ نظمیں ہندوستانی اور فارسی کی مرکب ہیں لیکن کتاب کی اصل عبارت میں بڑا تغیر ہے۔ جیسے کہ دیہاتی گیتوں اور کہانیوں میں ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں برابر ترمیم و تنسیخ ہوتی رہتی ہے۔ ہم کو کبیر کے دوہے ہندوستانی میں بھی ملی جلی زبان ملتی ہے لیکن وہ دراصل [illegible] کی خالص برج میں نہیں ہے۔ البتہ پنجابی شعراء کو ہندوستانی بہ نسبت برج کے زیادہ آسان معلوم ہوتی تھی۔ ہندوستانی کے ادبی زبان بننے کے امکان کا اظہار کبیر اور دوسرے پنجابی شعراء نے کیا تھا اور یہ دونوں (کبیر اور ہندوستانی) جو یو۔ پی کے مفرور دانشوروں کے لئے اچھوت ہیں۔ ہندوستانی شمالی ہند کی بولی کا نیا فارم (صورت) ہے جس میں مشرقی پنجابی اور مغربی ہندی کا عجیب امتزاج ہے۔ یہ اس گھر کی لڑکی ہے لیکن ایک ایسا بچہ جس کی کوئی دیکھ بھال نہ کرے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جیسا کہ یتیم کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ مسلمان بادشاہوں نے ہمیشہ دو قسم کے شاعروں کو اپنے دربار میں جگہ دی اور ان کی ہمت افزائی کی یعنی ہندی اور فارسی شعراء۔ لیکن ہندوؤں اور مسلمانوں کی اکثریت نے برج کو فوقیت دی جو گنگا کی اوپری دوآب کی اہم بولی تھی۔ برج کے مقابلہ میں ہندوستانی کہیں نہیں تھی اور صرف نوکروں کے گھروں تک محدود تھی۔ سولھویں صدی کے دوران میں مسلمانوں نے اپنی مذہبی شاعری ہندی زبانوں میں ہندی کا پیرایہ اور ہندو روایات کے ساتھ کرنی شروع کر دی تھی۔ اودھی میں جائسی کی پدماوتی (۱۵۴۰ء) اس قسم کا ایک زمانہ ہے جس نے نئے امکانات کے لئے زمین ہموار کی اور ایسی زبان بنائی جس پر تلسی نے غیر فانی رامائن لکھی۔

اورنگ زیب کے عہد میں جنوبی مسلم ریاستوں اور مرہٹوں کو دبانے کے لئے حملہ پر حملہ ہوتا تھا۔ اس طرح دکن میں شمالی ہند کے مسلمانوں کے مقبوضات بڑھے۔ یہ مسلمان فارسی سے دو ڈگریاں دور تھے اس لئے وہ اچھی فارسی نظمیں لکھنے کے اہل نہیں تھے لیکن فارسی عروض اور موزونیت کی روانی کو برقرار رکھ کر اپنی فنکارانہ خواہشات کی تسکین کے لئے انھوں نے ہندوستانی نظمیں فارسی عروض میں لکھنے کا آغاز کیا تھا اور اس شاعری کو "ریختہ" کہتے تھے اس لئے کہ اس شاعری میں فارسی کے الفاظ ادھر ادھر بکھرے ہوئے رہتے تھے۔

(باقی آئندہ)

اردو کی خبریں

بہار شریف — محمد سلیم الدین ہاشمی صاحب اطلاع دیتے ہیں کہ بزم اردو بہار کا ساتواں سالانہ جلسہ ۲۰ مارچ کو کالج ہال میں منعقد ہوگا جس کی صدارت جناب مولانا شرف الدین صاحب متولی وقف اسٹیٹ فرمائیں گے بزم میں متعدد موضوعات پر مقالات پڑھے جائیں گے جن پر انعامات دیئے جائیں گے۔ موضوعات حسب ذیل ہیں۔ مثلاً

اردو ادب میں طنز و ظرافت
پنڈت جواہر لال نہرو
پریم چند
اسلام اور کمیونزم
جمہوریت
ترقی پسند ادب میں عورت کا تصور
[illegible]
[illegible]
[illegible] ادب پر بہار کا حصہ
سرسید کی تحریک کا اثر اردو ادب پر
اردو کا بہترین مقالہ نویس وغیرہ وغیرہ
افسانوں اور نظموں اور غزلوں پر بھی انعامات کا اعلان کیا گیا ہے

حیدرآباد — حیدرآباد کے مورخ مسٹر نصیر الدین ہاشمی نے اردو مجلس کے ایک جلسے میں کہا کہ دنیا میں بولی اور لکھی جانے والی زبانوں میں اردو ہی ایک ایسی زبان ہے جو اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے عالمگیر مقبولیت کی حامل ہے۔ اسے ختم کرنے کی جتنی بھی کوششیں کی جائیں گی اتنی ہی وہ تقویت حاصل کرتی جائے گی۔

دنیا کے بیشتر ملکوں میں عوام کی مادری زبان نہ ہونے کے باوجود اردو کی ہمہ گیر مقبولیت اتنی کا اظہار ہوتا ہے۔

آپ نے بتایا کہ حیدرآباد کی آبادی میں سے آدھے لوگ اردو بولتے ہیں، پندرہ یا تین ہزار لوگ ایسے ہیں جو کہ حیدرآباد اور لکھنؤ والوں کی طرح اردو بولتے ہیں۔ یہاں سیکڑوں کتب خانے ہیں، جہاں اردو کے نوادر اور نایاب قلمی نسخے موجود ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کی ساری جدید و قدیم کتابیں وہاں موجود ہیں جو نہایت سلیقے اور ترتیب سے الماریوں میں سجی ہوئی ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کے کلام کا مطالعہ یہاں عوام بڑے ذوق و شوق سے کرتے ہیں۔

پٹنہ — ان دنوں بہار اسمبلی کے بجٹ سیشن میں حاکم جماعت کانگریس ہی کے ممبران اسمبلی اپنی حکومت کے کچے چٹھے کھول رہے ہیں۔ جو بجٹ پر کٹوتی کی تجویزیں آئی ہیں ان میں شاہ مشتاق احمد صاحب ایم ایل اے اور مولانا مسعود الرحمٰن صاحب ایم ایل اے نے حکومت کی توجہ اس جانب مبذول کرائی ہے کہ اس نے اردو لائبریریوں کو ان کا جائز حق اور ان کا حصہ دینے میں حد درجہ حق تلفی کی ہے اور اردو مدارس و مکاتیب کے ساتھ بھی حکومت کا رویہ غیر منصفانہ ہے۔ ان امور میں حکومت بالکل ناکام رہی ہے۔

بہار یونیورسٹی کے قریبی حلقوں سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ اس سال گزشتہ سالوں کی طرح جب یونیورسٹی بہار کے ایسے طلبہ نے جو آئندہ اپریل میں ایم۔ اے کا امتحان اردو، عربی اور فارسی کے مضامین میں دینا چاہتے ہیں اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تو ارباب یونیورسٹی نے پہلے ان کو درخواستیں دینے اور فیس جمع کرنے کی ہدایت کی۔ کہا جاتا ہے کہ یونیورسٹی کی اس ہدایت پر عامل ہوتے ہوئے عربی کے دو، فارسی کے [illegible] اور اردو کے چار طلبہ نے یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ آئندہ ایم۔ اے کے امتحانات میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ درخواست بھی دی اور فیس بھی جمع کی مگر اب یونیورسٹی کے ارباب اقتدار خاموش ہیں۔ اور اب یہ بتاتے ہیں کہ یونیورسٹی کے پاس روپے نہیں ہیں اس لئے سوالات چھپوانے اور دوسرے کاموں میں دشواریاں ہوں گی۔

اجمیر — انجمن ترقی اردو راجستھان کی شاخوں کے نمائندوں کا ایک جلسہ ۱۱ مارچ کو منعقد ہوا جس میں مندرجہ ذیل حضرات نے شرکت فرمائی۔

(۱) حضرت دیوان سید عنایت حسین علی خاں صاحب سجادہ نشین حضرت خواجہ بزرگ (۲) مولانا سید منظور الحسن صاحب برکاتی سکریٹری انجمن ترقی اردو ٹونک (۳) مولانا سید قاضی الاسلام صاحب جنرل سکریٹری جمیعۃ علما صوبہ راجستھان (۴) مولانا حفیظ محمد صاحب نائب صدر انجمن بیگوں راجستھان (۵) جناب سید نذیر احمد صاحب بیگوں راجستھان (۶) جناب مولانا حبیب اللہ صاحب ضیائی رکن انجمن ترقی اردو اجمیر۔ (۷) جناب مولانا سید غلام علی صاحب اجمیر (۸) الحاج سید عباس علی صاحب ایم۔ ایل۔ اے۔ اجمیر (۹) مولوی غلام رسول صاحب پاربوتی راجستھان (۱۰) عبدالحق صاحب بی۔ اے ایل ایل بی صدر درگاہ کمیٹی اجمیر (۱۱) میر محسن علی صاحب اودے پور (۱۲) مولانا مولوی فضل اللہ صاحب صدر جمیعۃ علما بیاور (۱۳) پروفیسر حامی الدین خاں صاحب نائب صدر انجمن ترقی اردو جے پور (۱۴) جناب اسلام الدین صاحب کامل سکریٹری اردو کالج جے پور۔

سب سے پہلے مولانا حبیب اللہ ضیائی صاحب صدر مجلس استقبالیہ

نے آنے والوں کو خوش آمدید کہا۔ اور قاضی عبدالغفار صاحب جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند کا پیغام پڑھ کر سنایا جو بذریعہ ٹیلیگرام صدر مجلس استقبالیہ کے نام آیا تھا۔ پیغام مندرجہ ذیل ہے۔

"کانفرنس میں شرکت نہ کر سکنے کا افسوس ہے۔ امید کہ آپ کی کانفرنس اردو کی ترقی کے لئے اسی مشکور ثابت ہوگی

انجمن کا انحصار اردو کے لئے آپ کے جذبہ محبت و مدد کی پر ہے"

مولوی احترام الدین صاحب شاغل سکریٹری انجمن ترقی اردو جے پور نے تحریری طور پر اظہار رائے کیا تھا کہ راجستھان اسٹیٹ اجمیر سے علیحدہ یونٹ ہے۔ راجستھان کی شاخوں کی تنظیم کا مرکز راجستھان ہی میں قائم ہونا چاہئے اجمیر کو علیحدہ رکھا جائے۔

مولانا فضائلی صاحب نے بیان کیا کہ اس اجتماع کا مقصد یہ تھا کہ راجستھان کی ریاستی شاخ جے پور ہی میں قائم کر دی جائے۔ اور اجمیر کی انجمن ترقی اردو علیحدہ رہے۔ انجمن ترقی اردو کے کام کو چونکہ راجپوتانہ میں سب سے پہلے اجمیر نے شروع کیا تھا۔ اس لئے مناسب سمجھا گیا تھا کہ موس کے متبرک اجتماع کے ایام میں راجستھان کی ریاستی شاخ کے قیام کا مسئلہ اجمیر میں بیٹھ کر طے کر دیا جائے۔ اسلام الدین صاحب کا آں نے بیان کیا کہ "ہماری زبان" میں قاضی عبدالغفار صاحب نے یہ اعلان کیا ہے کہ صوبجات میں ریاستی شاخوں کی مرکزیت اور تنظیم کے لئے جدید طریقوں اور قاعدوں کو وضع کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی ہے۔ یہ ضوابط جب سامنے آجائیں تو اسی قاعدے سے ریاستی شاخ کا انتخاب اچھا رہے گا۔ گفتگو کے بعد پروفیسر حاجی الدین صاحب نے مندرجہ ذیل تجویز کی جو بالاتفاق منظور ہوئی۔

"یہ اجلاس مناسب خیال کرتا ہے کہ راجستھان کی ریاستی شاخ کے قیام کے لئے ایک علیحدہ اجلاس کسی موزوں وقت پر جے پور میں طلب کیا جائے اور اسٹیٹ اجمیر کی انجمن ترقی اردو کو اپنی جگہ علیحدہ ہی باقی رکھا جائے۔"

محرک :۔ پروفیسر حاجی الدین نائب صدر انجمن ترقی اردو جے پور۔

مؤید :۔ مولانا سید قاضی الاسلام صاحب۔

مولوی سید قاضی الاسلام صاحب نے راجستھان میں اردو کی اشاعت کو بیان کیا۔ کہ ہائی اسکولوں میں ہزاروں اردو خواں طلبا اس زبان کی تعلیم سے محروم ہو گئے ہیں۔ ضرورت ہے کہ پرائیویٹ ادارے اور مکاتب زیادہ سے زیادہ تعداد میں قائم کئے جائیں۔ اس سلسلے میں آپ نے دارالعلوم خلیلیہ ٹونک کے اردو شعبے کی مساعی اور اردو امتحانات پر روشنی ڈالی اور ان کوششوں کا ذکر بھی کیا جو انجمن ترقی اردو ٹونک اور جمعیۃ علماء راجستھان کی جانب سے اردو کے فروغ کے سلسلے میں انجام دی گئی ہیں۔

صدر اجلاس حضرت دیوان سید عنایت حسین علی خاں صاحب سجادہ نشیں حضرت خواجہ بزرگ رحمۃ اللہ علیہ نے آخر میں اپنی دعائیہ صدارتی تقریر میں فرمایا کہ :۔

صوفیائے کرام کا ورود ہندوستان میں فاتحین کی تلواروں کے زیر نہ تھا۔ بلکہ مسلمان فاتحین سے بہت پہلے صوفیائے کرام یہاں تشریف لا۔ اور ہند کے قدیم فلسفۂ مذہب کو انھوں نے پسند کیا۔ صوفیوں کی خدا پرستی، ہم اور حق شناسی کی بدولت اس ملک کے لوگوں نے ان کی ہم نشینی اور صحبت کے اثر کو قبول کیا۔ اس میل جول نے ایک نئی زبان کی بنیاد ڈالی جس کو اردو کہتے ہیں۔ صوفیوں کا تعلق چونکہ شاہی دربار سے نہیں بلکہ ہمیشہ عوام الناس سے رہا ہے اس لئے اردو درحقیقت ایک عوامی زبان کے طور پر وجود میں آئی۔ بعد میں جب دربار شاہی میں اس کا نکھار اور جیب ، دلوں کو بھاگئی تو اس زبان نے اپنا چولا بدلا۔ اور عربی، فارسی الفاظ اور بلند خیالات سے شان و شکوہ حاصل کیا۔ ورنہ دربار میں داخل ہونے سے پہلے اس زبان میں جبکہ یہ صوفیوں کی مجلس میں تھی اس کو اس ملک کی بھاشا سے امتیاز حاصل نہ تھا۔ اس دور میں اس کو ہندی ہی کہا جاتا تھا۔ خواہ وہ فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہو۔ اردو زبان کی اس ملک میں اتحادی شان یہی تو ہے کہ مسلمانوں نے ہندی زبان کو ایک نیا رسم خط دیا ہے۔ ہندی زبان فارسی رسم خط میں آکر اردو کہلاتی ہے۔ ہندی زبان سے فارسی رسم خط کو جدا کرنا تفرقی پسندی کا جذبہ ہے، اور مسلمانوں کو ہندوؤں سے جدا کرتا ہے۔

مجھے قوی بھروسا اور امید ہے کہ اردو زبان کی تاریخ اور اس کا پس منظر چونکہ بہت مخلصانہ اور شاندار ہے اس میں کوئی تعصب اور سیاست نہیں ہے اس لئے یہ زبان مع اپنے رسم خط کے اس ملک میں ضرور باقی رہے گی اور مسلمانوں کے اولیاء اللہ اور ہندوؤں کے رشیوں منیوں کے زیر سایہ پروان چڑھتی رہے گی۔

جناب صدر اور نمائندگان کے شکریہ کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

(نامہ نگار)

بھوپال پروفیسر ستیہ پرکاش سنگھ کے مکان "ہمایوں منزل" بھوپال میں ۱۳ مارچ ۷۸ء کو بوقت [illegible] بجے شب حلقۂ دانشوراں کا پانچواں اجلاس زیر صدارت ڈاکٹر شکیت منعقد ہوا۔ سب سے پہلے ارشد صدیقی ساگری نے بحیثیت سکریٹری گزشتہ جلسے کی کارروائی پڑھ کر سنائی۔ اس کے بعد مسٹر علیم ربانی نے اپنا افسانہ "چوکیدار" سنایا۔ میر یاور اختر سعید نے کہا کہ افسانہ میں کردار بہت زیادہ ہیں اس کے علاوہ لیلا بھی اسے افسانہ نہیں کہا جا سکتا۔ کوثر چاند پوری نے کہا کہ کرداروں کی کثرت کے باوجود افسانہ وحدت تاثر کا حامل ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہت جلدی میں لکھا گیا ہے۔ اس میں گہرائی پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد اختر سعید نے اپنی مسلسل غزل سنائی۔ جس پر آصف شاہمیری، کوثر چاند پوری، شفا گوالیاری اور پروفیسر دکشت نے

تنقید کی۔ اختر صاحب نے تنقید کے جوابات پیش کئے۔ الیم خان نے اپنا مسلسل مقالہ نہر سویز کا تاریخی اور سیاسی پس منظر سنایا۔ اختر سعید کے ایک سوال پر کوثر چاند پوری نے حلقہ میں پڑھے جانے والے مضامین کی وضاحت کی اور کہا کہ حلقہ دانشوراں صرف ادب تک محدود ہے آج کے ادب اور سیاست میں جو تعلق ہے اسے اس حد تک تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ صرف نظریاتی سیاست پر مقالہ پڑھا جا سکے۔ عملی اور مقامی سیاست اور پروپیگنڈے سے متعلق چیزیں بالکل نہیں پڑھی جا سکیں گی۔

مسٹر جیت رام چوپڑا اور پروفیسر دکشت نے بھی ادب اور سیاست پر نظریاتی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی۔

۲۰ مارچ کو ہونے والے آئندہ اجلاس کے لئے حسب ذیل پروگرام طے کیا گیا۔

مقالہ تقریری :- اختر سعید

افسانہ ۔ نذیر رحمانی

غزل ارشد صدیقی ساگری

نظم پروفیسر دکشت

اس کے بعد غیر رسمی دور میں پروفیسر دکشت، شفا گوالیاری، ارشد صدیقی ساگری، عزیز گوالیاری، مولانا منظور، وحید پرویز اور حلیم کوثر نے منظوم کلام سنایا۔ آج کے اجلاس میں ممتاز افسانہ نگار زہرہ جمال صاحبہ نے بھی شرکت کی۔ (نامہ نگار)

حیدرآباد

آل انڈیا اردو کانفرنس کے انتظامات بڑے پیمانہ پر ہو رہے ہیں۔ باہر کے متعدد مشہور ادیب اور شعرا کانفرنس میں شرکت کریں گے۔

توقع ہے کہ حیدرآباد کے چیف منسٹر شری رام کشن راؤ کانفرنس کا افتتاح کریں گے اور شری گوپی ناتھ امن وزیر ریاست دہلی صدارت فرمائیں گے۔

لکھنؤ

انجمن ترقی اردو لکھنؤ کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ ۱۲ مارچ ۱۹۶۸ء کو پنڈت کشن پرشاد کول کی صدارت میں ہوا اور اس نے انٹرمیڈیٹ کے مجوزہ تعلیمی نصاب پر غور کیا جو بورڈ آف ہائی اسکول اینڈ انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن یوپی نے گورنمنٹ گزٹ یوپی حصہ چہارم مورخہ ۲۷ جنوری ۱۹۶۸ء میں شائع کیا ہے۔

مجلس عاملہ کو یہ نصاب ناقابل اطمینان نظر آیا۔ کیونکہ وہ طالب علم جو ہندی یا کوئی دوسری جدید ہندوستانی زبان لے گا وہ پھر اس کے ساتھ اردو نہیں لے سکے گا۔

اس لئے مجلس عاملہ نے فیصلہ کیا کہ محکمہ کے ذمہ داران سے درخواست کی جائے کہ مجوزہ تعلیمی مضامین کی فہرست میں ذیل کا اضافہ کر دیں۔

ہندی کے علاوہ جدید ہندوستانی زبانوں میں سے ایک زبان جو دستور ہند کی فہرست ۸ میں دی ہوئی ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ طالب علم جو اس زبان کو بحیثیت لازمی مضمون کے لے گا وہ اسی کو اختیاری مضمون کی طرح نہیں لے سکے گا۔

انجمن کی کتابیں

مرقع افغان

یہ ایک تاریخی مخطوطات ہے۔ جس کو مولوی ابرار حسین فاروقی صاحب ایم۔ اے نے بڑی تحقیق اور کاوش سے جمع کیا ہے۔ اور بہت سی قلمی کتابوں کے حوالے سے سلطان بہلول لودھی کی زندگی کے واقعات کو بیان کیا ہے۔

قیمت تین روپے چار آنے

حیات اجمل

اس کے مرتب قاضی محمد عبد الغفار صاحب تھے اس سوانحیات کا بہت دنوں سے انتظار تھا۔ اس میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کی سوانح عمری ہی نہیں بلکہ اس دور کی پوری سیاسی تحریکات کا خاکہ پیش کیا گیا ہے جس میں حکیم صاحب مرحوم کے عظمت و کردار کا پتہ چلتا ہے۔

اس کتاب کی بڑی خوبی مصنف کے انداز بیان کی دل کشی بھی ہے جس کے متعلق بمبئی کے انگریزی اخبار بھارت جیوتی نے لکھا ہے کہ :۔

"قاضی محمد عبد الغفار نے جو اردو کے بہت بڑے عالم اور انشاپرداز ہیں ایک عظیم الشان شخصیت کی سوانح حیات لکھ کر بڑی خدمت انجام دی ہے یہ کتاب اس زمانے کے سیاسی انقلابات کی ایک مستند تاریخ ہے اور پر لطف اردو میں لکھی گئی ہے۔"

قیمت مجلد آٹھ روپے

کچھ زر کی بابت

اردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جس میں ابو سالم صاحب ایم۔ اے بیلنگ۔ نے یہ بتایا ہے کہ "زر" کیا ہے چند عنوانات سے اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ کیجئے۔

ہمارے سماج میں زر کی اہمیت۔ زر کی قسمیں۔ کیا بینک زر پیدا کر سکتے ہیں۔ مرکزی بینک۔ زر کی قیمت کا تصور۔ زر کی عام قیمت کا تعین کیوں کر ہوتا ہے زر کے متعلق پالیسی کیا ہو۔ بیرونی زر۔ گولڈ اسٹینڈرڈ۔ یہ اور اس قسم کے اور دوسرے بہت سے سوالات کا جواب اس کتاب میں ملے گا۔ اس کتاب کی اہمیت اور ضرورت پر ملک کے تمام بڑے بڑے ماہرین زر نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے

قیمت غیر مجلد ۴ روپے۔ مجلد ۴ روپے آٹھ آنے

غزل

مجروح سلطانپوری کے کلام کا یہ مجموعہ جس قدر مختصر ہے۔ اسی قدر دل کش بھی ہے۔ اس دور کے نوجوان شعرا میں مجروح اپنا ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ انجمن نے ان کے کلام کو یہ کتابچہ اتنی ہی نظر نواز صورت میں چھاپا ہے جس قدر دلنواز مجروح کا کلام ہے

قیمت مجلد ایک روپیہ آٹھ آنے

ناشر: ... عبد ... انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔ پرنٹر: نیشنل پرنٹنگ ورکس علی گڑھ